فیض کی شخصیت اور شاعری

FAIZ'S PERSONALITY AND POETRY

افتخار عارف[1]

Abstract:

In this article, the life and poetry of world renowned Progressive poet Faiz Ahmad Faiz have been discussed and analyzed. Faiz was a true idealist. He struggled for the great cause of Humanity and Progressive Movement. His poetry is true reflection of his thoughts. He was a real representative of Pakistan in all over the world.

لکھنے والا اپنے ملک اور اپنے عوام کا وفادار ہوتا ہے اور وہ عوام کا دوست اور ان کا دانشور اور رہنما ہوتا ہے۔ اس کا کام ہے عوام کو جہالت، توہمات، روایات اور تعصبات کے اندھیرے سے نکالنا اور علم و دانش کی روشنی کی طرف لے جانا اور اس کا کام ہے عوام کو جبر سے آزادی کی طرف اور مایوسی سے اُمید کی طرف لے جانا۔(۱)

شاعر، سیاست دان اور فلاسفر زندگی کے آئیڈیلزم اور حقائق دونوں کو یکجا کرتے ہیں۔ وہ رومانویت اور حقیقت میں ایک قسم کی مفاہمت پیدا کرتے ہیں۔ جب ہم کلاسیکل سدا بہار شاعری پر نظر ڈالیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ حال کے آئینے میں مستقبل کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔(۲)

> ''حیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسبِ توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔''(۳)

فیض احمد فیض بیسویں صدی کے نصف آخر میں اُردو کے سب سے محبوب اور مشہور شاعر کی حیثیت سے دنیا بھر کے ادبی اور عوامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی ہی میں ایک Legend اور ایک قابلِ رشک روایت کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ وہ رہنما تھے، دانش ور تھے مگر ایک شاعر کی حیثیت سے، ایک نقاد کی حیثیت سے ایک صحافی اور ایک فلم ساز کی حیثیت سے، ایک مزدور رہنما کی حیثیت سے، ایک ترقی پسند دانش ور کی حیثیت سے انھوں نے اپنے عہد کی قومی زندگی پر بہت گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ فیض کی، دل کو چھو لینے والی شاعری اور من موہنی شخصیت عوام میں بھی محبوب تھی اور ادبی حلقوں میں بھی۔ ترقی پسند تحریک کی ترجمانی ہو یا صحافت اور ثقافت کے کوچوں میں قیام کا زمانہ، قید و بند کی صعوبتیں ہوں یا جلاوطنی کا دور، فیض کی شاعری ہر جگہ ہر زمانے میں ان کی ترقی پسند انقلابی فکر کی تصدیق کرتی نظر آتی ہے۔ حقیقتاً وہ اپنے زمانے میں ادب و ثقافت کی سب سے مؤثر شخصیت کے طور پر عوام و خواص میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ دنیا بھر کی ادبی تاریخ میں اور خاص طور پر برصغیر کی ادبی زندگی میں، فیض ترقی پسند فکر کے سب سے معتبر، مستند اور محبوب ترجمان کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ فکر و خیال، جذبہ و احساس اور نغمہ و آہنگ کا جیسا حسین امتزاج ان کی شاعری میں نظر آتا ہے وہ فیض کو عالمی سطح کے عظیم انقلابی رومانوی شعراء پبلو نرودا، ناظم حکمت اور مایاکوفسکی کی صف میں جگہ دلاتا ہے۔

فیض احمد فیض بیرسٹر سلطان محمد خاں اور سلطانہ فاطمہ کے گھر ۱۳۔فروری ۱۹۱۱ء کو قصبہ کالا قادر، سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۰۔نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی شاعری کے کم و بیش آٹھ مجموعے ''نقشِ فریادی'' ۱۹۴۱ء، ''دستِ صبا'' ۱۹۵۲ء،

---

[1] سابق چیئرمین مقتدرہ قومی زبان، سابق چیئرمین، پاکستان اکادمی ادبیات، اسلام آباد

''زنداں نامہ'' ۱۹۵۶ء، ''دستِ تہِ سنگ'' ۱۹۶۵ء، ''سرِ وادیٔ سینا'' ۱۹۶۹ء، ''شام شہر یاراں'' ۱۹۷۸ء، ''میرے دل میرے مسافر'' ۱۹۸۱ء اور بعد میں ان کی کلیات ''سارے سخن ہمارے'' اور ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکی تھیں۔ فیض کی شاعری کے بین الاقوامی تراجم نے ان سے فیض یاب ہونے والے حلقوں میں مزید اضافہ کیا۔ انگریزی میں وکٹر کیرنن، نیومی لیزارڈ، داؤد کمال، کیرولین کائزر، خالد حسن، محبوب الحق اور دیگر مترجمین نے ان کے کلام کو انگریزی زبان کے ذریعے دنیا میں ان لوگوں تک پہنچایا جو براہِ راست اُردو سے استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ روسی زبان میں ریما کازاکاوا اور مریم سلگانیک نے یادگار ترجمے کر کے انھیں پورے یورپ میں متعارف کروایا۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل تک کا دور نوآبادیاتی نظام کے خلاف آزادی کی جدوجہد کی عظیم تحریکوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ادب اور زندگی لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ ہماری قومی زندگی میں کلام فیض، کلام اقبال کے بعد سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کلام ہے۔

فیض کا نام پاکستان کی ثقافت و ادب کے مترادف نام کے طور پر لیا جاتا ہے۔

بیسویں اکیسویں صدی میں ادب کی قدر و قیمت کے تعین کے لیے بے شمار اچھے بُرے بے شمار معیارات نقد و نظر سامنے آئے ہیں۔ ایک تصور یہ بھی سامنے آیا ہے کہ ادب کسی عہد کے احوال و ماجرا کو جاننے کا سب سے قابل اعتبار حوالہ ہے۔ مورخ اور میڈیا بھی صورت حال کو محفوظ رکھتے ہیں مگر کلی طور پر اسے درست ماننے میں تامل ہوتا ہے۔ ادب کی ترجمانی سب سے لائق اعتبار ہے۔ نقش فریادی سے شام شہر یاراں تک نسخہ ہائے وفا کا ایک ایک مصرعہ اس کی گواہی دیتا نظر آتا ہے۔

پچھلے چند عشروں میں فیض پر جتنی حوالے کی کتابیں شائع ہوئیں اور جتنی زبانوں میں ان کے تراجم شائع ہوئے وہ ان کی ہمہ گیر مقبولت پر گواہ ہیں۔ مرزا ظفر الحق، اشفاق حسین، ایوب مرزا سے فیضیات کا جو آغاز ہوا تھا اس میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد، مظہر جمیل، تقی عابدی، احمد سلیم، منیر سلیچ، لدمیلا وسیلیوا کی کتاب ''فیض کے احوال و آثار'' کے مستند حوالے فراہم کرتی ہیں۔

ہمارے بزرگ آغا ناصر نے ایک نہایت عمدہ کتاب فیض صاحب کے تخلیقی سفر کے حوالے سے قلم بند کی تھی۔ ''ہم جیتے جی مصروف رہے'' تاریخی سفر کے تمام اہم مرحلوں کا شاعرانہ تبصرہ، بیان، دستاویز ہماری تاریخ کا معتبر ترین حوالہ ہے۔

صبح آزادی--- یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر---وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں--- نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی!

فیض کے ہاں دونوں لہجے، احتجاج کا لہجہ، انکار کا لہجہ اور دوسری طرف رومان کا لہجہ اور عشق کا لہجہ، اتنا خوبصورت امتزاج، کاہے کو اردو شاعری نے پہلے دیکھا ہو گا۔ فیض صاحب بڑے شاعر تھے۔ بڑے ترقی پسند آدرش وادی تھے۔

فیض صاحب کی قید و بند کی زندگی بہت تکلیف دہ مگر بے حد موثر ہے۔ دنیا بھر کی حبسیہ شاعری میں '' زنداں نامہ'' کو بہت نمایاں مقام حاصل ہے۔ ناظم حکمت، پابلو نرودا، ارنسٹو کارڈینیل، ہمارے زمانے میں حبیب جالب سمیت اور بھی بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے زنداں کی زندگی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں مگر حبسیہ شاعری میں جو مقام '' زنداں نامہ'' کو حاصل ہے وہ شاید ہی کسی اور کتاب کو حاصل ہو۔

فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز میں بہت یادگار دِن گزارے۔ پاکستان ٹائمز میں بحیثیت مدیر کے اُن کے اداریے ایسے ہیں جن پر سر دھننا چاہیے۔ فیض صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو دیر سے آتے اور اپنے اداریے آخر وقت تک موخر کرتے رہتے اور جب بالکل پرچہ جانے کو ہوتا تو پریس میں جانے تک وہ اپنے اداریے مکمل کرتے تھے۔ حمید اختر صاحب نے جو اُن کے رفیق کار تھے، اُن کے دیرینہ دوست بھی تھے اور اُن کے ساتھ انہوں نے کام بھی کیا تھا۔ اس کا سبب یہ بتایا کہ وہ دراصل اُس پر غور کرتے رہتے اور سوچتے رہتے، جو بھی موضوع انہوں نے منتخب کیا ہوتا تھا اداریے کے لیے۔ جب شام کو بالکل وہ اس پر حاوی ہو جاتے اور ساری چیزیں، تمام جہات اُن پر روشن ہو جاتیں تو اُس کو قلم بند کرتے تھے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس میں فیض صاحب کی کاہلی کو بھی دخل ہو گا۔ فیض صاحب تساہل پسند واقع ہوئے تھے۔ بعض چیزیں وہ موخر کر دیتے تھے

اور جب وہ آخری وقت آتا تو شاید اُن کو لکھنے میں نسبتاً آسانی محسوس ہوتی ہو گی اور وہ اس کام کو شدت کے ساتھ اُس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے موخر کرتے ہوں۔ فیض صاحب کے بارے میں بہت سی باتیں کی جاتی ہیں۔ نظریاتی طور پر ترقی پسند تحریک سے وہ ہمیشہ وابستہ رہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ملک میں ترقی پسند فکر کے حوالے سے بہت مشکل حالات پیدا ہوئے تب بھی انہوں نے اس تحریک کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُس آدرش سے رو گردانی نہیں کی جو اُس کا اصل اصول تھا۔ جو اُس کے اہداف تھے، اُن کی ہمیشہ انہوں نے حمایت کی۔ اُن پر بہت الزام لگے اور اُن کو کہا گیا کہ وہ روس نواز ہیں، کیمونسٹ اور چین نواز اصطلاحیں اُس زمانے میں بہت وضع کی جاتی تھیں مگر فیض صاحب نے اس کی پروا کیے بغیر بین الاقوامی سطح پر اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔

فیض صاحب کا جو ایک اور بڑا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ادبی سطح پر اور تہذیبی سطح پر ایک بات منوائی۔ قلم اور اہل قلم کا احترام کیا جانا چاہیے اور اُن کا اعتبار اور وقار بلند کرنے کے حوالے سے فیض صاحب نے بہت عملی نوعیت کے کام کیے۔ ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ اقبال کے بعد معاشرے کے طبقہ اشرافیہ میں اور عوام دونوں میں متذکرہ حوالوں کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے میں فیض صاحب نے بہت بنیادی کردار ادا کیا اور وہ خود اس کی مثال تھے۔ وہ جس محفل میں تشریف لاتے، جہاں اہلِ دانش کی محفل ہو، سیاست کی محفل ہو، عوام کی محفلیں ہوں، مجالس ہوں، فیض صاحب کا بہت احترام کیا گیا اور عجیب و غریب صورتِ حال تھی کہ فیض صاحب بہت شکر گزار آدمی تھے۔

فیض نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک زمانہ ہوا غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدہ بینا نہیں، بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہم عصر ہوتے تو کوئی نہ کوئی ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے۔ غالب ادب میں پروپیگنڈے کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریحاً پروپیگنڈہ ہے۔ اُس کی آنکھ تو صرف حسن سے غرض رکھتی ہے۔ حسیاتِ انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور اس جدوجہد میں حسب توفیق زندگی ہی نہیں فن کا تقاضا ہے:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے[۴]

فیض صاحب کی شاعری کی طرح اُن کی نثر بھی بے حد دل آویز اور بہت خوبصورت ہوتی تھی۔ جب اُن کو ماسکو سے بین الاقوامی امن انعام دیا گیا تو وہاں انہوں نے اُردو میں بہت ہی خوبصورت تقریر کی۔ اُس کا ایک پیرا آپ کو سُنا دوں جو کسی نظم کی طرح خوبصورت ہے۔ یوں تو مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیز ہے اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ شاعر کا قلم ہے اور مصور کا موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور اور ذہانت اور شجاعت، نیکی اور رواداری، اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوش مند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے لیکن بد قسمتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں بر سرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تعمیر، ترقی و زوال، روشنی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں۔ یہ صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گذشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا خون خرابا نہیں ہے۔ نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ

مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں آدم کی بقا اور فنا۔ ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دار و مدار ہے، انہیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی یا بربادی کا انحصار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں مانی، اب بھی فتح یاب ہو گی اور آخر کار جنگ و نفرت، ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بناوہی ٹھہرے گی، جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شاعر حافظ کی تھی:

خلل پذیر بود ہر بنائے کہنہ
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است(۵)

ہم دعا مانگتے ہیں۔ دعا ہماری آرزو کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ہماری امید، ہماری خواہش، ہماری تمنا دعا کے لفظوں میں ڈھل جاتی ہے۔ فیض نے بھی بہت خلوص کے ساتھ اپنی طرف سے، ہم سب کی طرف سے دعا مانگی تھی۔

ایک ادیب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایسا ادب تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لیے ہو۔ اس کو ایسا ادب تخلیق کرنے پر بھی قدرت ہونی چاہیے جو صرف ایک لمحے کے لیے ہو۔ اگر اس ایک لمحے میں اس کی قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔

ماسکو میں دونوں بزرگ ایک ہی ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ کیفی نے فیض کے بارے میں عمدہ بات کہی ہے۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ فیض صاحب کا دل زیادہ خوبصورت ہے یا ان کی شاعری۔ ان کی شاعری اس لیے زیادہ خوبصورت ہے کہ ان کا دل بہت خوبصورت ہے۔

اکیسویں صدی کے آغاز کے اس مرحلے پر امن، آزادی، زندگی اور حُسن سے محبت کرنے والے لوگ اور ساری دُنیا کے مجبور و مظلوم اور حقوق سے محروم عوام اہلِ قلم کے ایک ایسے قافلے کے منتظر ہیں جو اُن کے دُکھوں کا مداوا کر سکے۔ اُن کے زخموں پر مرہم رکھ سکے اور اُن کو قلم کی ہمقدمی کا احساس دلا سکے:

دل ناامید تو نہیں ہے ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے (۶)

آخر میں فیض صاحب کی ایک دُعا:

آیئے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسمِ دُعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت ، کوئی خُدا یاد نہیں
آیئے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِامروز میں شیرینی فردا بھر دے
وہ جنھیں تابِ گراں باری ایّام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رُخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے

جن کی قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے اُن کو
ہمّتِ کفر ملے ، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے (۷)

حوالہ جات

۱۔ احتساب، لاہور، نمبر ا، مارچ، اپریل، مئی۔۷۹۔۱۹۷۸ء

۲۔ پروفیسر فتح محمد ملک، فلسطینی ادب اُردو میں، فروری ۱۹۸۳ء

۳۔ ''دستِ صبا'' کے ابتدائیے کے یہ الفاظ فیض کے فلسفۂ زندگی کا لبِ لباب اور ان کے فنِ شاعری کا عقیدہ بھی ہے ۔

۴۔ فیض احمد فیض، دست صبا، لاہور: مکتبہ کاروان، ۹۸ ۱۹ء، ص ۱۰۷

۵۔ لینن امن انعام کی تقریب، ماسکو، ۱۹۶۲ء

۶۔ فیض احمد فیض، زنداں نامہ، کلیات فیض، لاہور: مکتبہ کاروان، ۹۸ ۱۹ء ص ۲۵۷

۷۔ فیض احمد فیض، سر وادیٔ سینا، کلیات فیض، لاہور: مکتبہ کاروان، ۹۸ ۱۹ء، ص ۴۲۳